⊙ ڈاکٹر راشدہ قاضی
پرنسپل، گورنمنٹ گرلز کالج آف کامرس، ڈیرہ غازی خان

احمد ندیم قاسمی کی خاکہ نگاری

Abstract:

Ahmed Nadeem Qasmi as a versatile personality holds a distinct status and repute in various genres of literature. In the field of poetry, he had full command over the presentation of Ghazal, Nazm and Qata'at while in prose he had distinction in short story writing, play-writing, columns and editorial and in sketch-writing as well. He earned and enjoyed a good name as a prominent literary for decades. In this study two books of Ahmed Nadeem Qasmi *Mere Hamsafar* (2002) and *Mere Hamdam* (2007) have been considered for analyzing sketch-writing of Qasmi. These two books consist of 32 sketches. As a matter of fact he depicted the entire age through his sketches. The indications of literary extract entice the attention of the reader. These sketches are actually biographies. Life has been portrayed through these writings as it existed in Qasmi's time.

Keywords:

Nadeem Qasmi Sketch-writing Sketches Hamsafar Hamdam

احمد ندیم قاسمی کی ادبی پہچان کے کئی حوالے ہیں۔ وہ شاعر ہیں، انہوں نے غزلیں، نظمیں، گیت اور قطعات کہے۔ نثر میں انہوں نے افسانے، ڈرامے لکھے۔ غیر افسانوی نثر میں فکاہی کالم لکھے۔ تہذیب وفن کے حوالے سے مباحث چھیڑے اور صحافت کو ادب کے درجے پر پہنچایا۔ سوانحی پہلو سے خاکہ نگاری کی جن میں ہم عصروں کی سوانح کے ساتھ ساتھ خود اپنی سوانح کا پہلو بھی شامل رہا۔ ان تمام معاملات میں ان کی حیثیت ایک ترقی پسند ادیب کی بھی تھی۔ ان کے ایک ہم عصر ترقی پسند فارغ بخاری نے قاسمی صاحب کے بارے میں لکھے گئے اپنے خاکے میں فکاہی رنگ میں اس طرح اظہار خیال کیا ہے:

''ویسے تو ہمارے ہاں بڑے بڑے اہل قلم پڑے ہیں لیکن اپنے قلم کا جس بے رحمی سے انہوں

(قاسمی) نے استعمال کیا ہے کہ اس قلم کی زبان ہوتی تو وہ بھی ان سے پناہ مانگتا..... جو احباب ان کی ادبی مصروفیات سے واقف ہیں وہ بخوبی جانتے ہیں کہ یہ شب و روز ایک کمپیوٹر کی طرح مصروفِ کار رہتے ہیں۔ روز نامہ 'امروز' اور روز نامہ 'جنگ' کی کالم نویسی، مجلس اردو کی ملازمت، مجلّہ فنون کی ادارت کے علاوہ ریڈیو، ٹیلیویژن کے لئے مسلسل لکھنا، مشاعروں کو بھگتنا اور اکثر و بیشتر ادبی تقریبات کی صدارت کے فرائض انجام دینے کے بعد، نہ جانے وہ اتنا وقت کہاں سے نکال لیتے ہیں کہ روزانہ دوستوں کی محفل بھی جماتے ہیں، کم از کم پچاس مفید کتابوں کے دیباچے اور ریویو بھی نپٹاتے ہیں اور صرف یہی نہیں بلکہ اکثر دوستوں کے خطوط کے جواب بھی خود دیتے ہیں۔''(۱)

گویا نظم، غزل، افسانے سے لے کر مکتوب نگاری اور خاکہ نگاری تک کم و بیش ادب کی ہر صنف سے انصاف کیا ہے۔ جہاں تک خاکہ نگاری کا تعلق ہے تو اس صنف میں ان کے دو مجموعے میرے ہمسفر (۲) اور میرے ہمقدم (۳) منظرِ عام پر آئے۔ پہلا مجموعہ اُن کی زندگی میں ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا جبکہ دوسرا اُن کے انتقال کے بعد ۲۰۰۷ء میں سامنے آیا۔ بتیس خاکوں پر مبنی یہ دو مجموعے احمد ندیم قاسمی کے پورے عہد کا احاطہ کرتے ہیں۔ جن میں ان کے بتیس ہم عصر اور وہ خود زندگی کے سٹیج پر اپنا کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے زندگی کے ایک طویل عرصے تک خاکے نہیں لکھے۔ دراصل ان کے خاکہ نگاری کی طرف آنے کی بھی ایک کہانی ہے۔ خود احمد ندیم قاسمی کے مطابق:

''بہت مدت تک مجھے اس محبت بھرے مطالبے کا سامنا رہا کہ میں اپنے سوانح لکھوں..... افسوس کہ میرے معمولات میں سے اس کام کے لئے وقت ہی نہ مل سکا۔ میں نے ایک بار اپنے حالاتِ زندگی کے نوٹس لینا شروع کیے تو میرے بچپن کے ابتدائی نو دس برسوں کی یادیں بھی ایک سو صفحات پر محیط ہوتی محسوس ہوئیں۔ یوں میں اپنی خودنوشت تحریر کرنے کے ارادے سے دستکش ہو گیا۔ اس دوران میری (منہ بولی) بیٹی منصورہ احمد نے ایک قابلِ عمل تجویز پیش کی۔ اس نے کہا کہ آپ نے اپنی طویل زندگی میں علم و ادب اور شعر و فن کی اہم شخصیات کے ساتھ خاصا طویل وقت گزارا ہے۔ جب آپ ان شخصیات سے متعلق اپنی یادوں کو سمیٹیں گے تو بالواسطہ طور پر خود اپنے سوانح کے بعض حصوں کا بھی ذکر کرتے چلے جائیں گے۔ بیٹی کی یہ تجویز میرے دل کو لگی چنانچہ میں نے اس نتیجہ خیز تجویز کو عملی صورت دینے کا تہیہ کر لیا۔''(۴)

یوں اردو ادب کا یہ ہمہ جہت فنکار ایک ممتاز خاکہ نگار کے طور پر ابھرا۔ ان کے اہم اور نمایاں خاکوں میں منٹو، فیض، عبدالمجید سالک، کرشن چندر، غلام رسول مہر، خدیجہ مستور، ابنِ انشا، ن۔م۔راشد، چراغ حسن حسرت، امتیاز علی تاج، محمد طفیل، اختر شیرانی، احسان دانش، ظہیر کاشمیری، ظہور نظر، پروین شاکر، اطہر نفیس، حسن عابدی زیادہ قابلِ ذکر ہیں۔ انہوں نے دادا امیر حیدر، مرزا محمد ابراہیم اور ڈاکٹر اقبال شیدائی جیسے انقلابیوں اور تحریک آزادی کے سرگرم سپاہیوں کے خاکے بھی لکھے۔ ان کی دونوں کتابوں میں بیسویں صدی کا ادب و فن، انقلابی سیاست اور ترقی پسند تحریک سمٹ کر یکجا ہو گئی

ہیں۔ یہ خاکے ان شخصیات کی زندگی اور فن پر روشنی ڈالتے ہی ہیں لیکن ان کی اضافی خوبی یہ ہے کہ ان میں خود احمد ندیم قاسمی کا خاکہ بھی ٹکڑوں میں سہی لیکن نظر ضرور آتا ہے۔ فیض اور منٹو پر انہوں نے جم کر لکھا ہے۔ منٹو کی کردار سازی اور فیض کی کردار کشی میں وہ ہم عصر خاکہ نگاروں میں سب سے آگے نکل گئے۔ کہیں کہیں تو یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ ان دو شخصیتوں کی آڑ میں دراصل انہوں نے خود کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ ن م راشد کا خاکہ بھی اسی قد کاٹھ کا ہے جس میں راشد کے لئے ناگواری کے تاثرات کے ساتھ ساتھ خود اپنی ستائش کا پہلو بھی نمایاں ہے۔ اسی خاکے سے آغاز کرتے ہیں، اقتباس دیکھیے:

> ''میں تاریخیں یاد رکھنے کے معاملے میں بہت کوتاہ ہوں۔ میرے اندازے کے مطابق یہ 1941ء کے آس پاس کا ذکر ہے کہ دہلی ریڈیو میں جدید نظم نگاروں کا ایک یادگار مشاعرہ منعقد ہوا۔ اس میں حفیظ جالندھری، ڈاکٹر تاثیر، ڈاکٹر تصدق حسین خالد، فیض احمد فیض، ن۔م۔ راشد، میراجی، روش صدیقی اسرار صدیقی، مجاز اور چند دوسرے شعرا کے علاوہ میں نے بھی شرکت کی۔ میں منٹو کے ہاں ٹھہرا جو اس زمانے میں وہاں سکرپٹ رائٹر تھا۔ میں نے اپنی نظم 'نیا ساز نئی تان' پڑھی جو میرے پہلے مجموعۂ کلام 'جلال و جمال' میں شامل ہے۔ یہ نظم چار چار مصرعوں کے 13 بندوں پر مشتمل ہے۔ ہر بند کا پہلا اور چوتھا مصرع اور اسی طرح ہر بند کا دوسرا اور تیسرا مصرع ہم وزن، ہم قافیہ اور ہم ردیف ہیں۔ داد تو مجھے ملی مگر منٹو نے یہ غضب ڈھایا کہ (شاید بسلسلہ دوست نوازی، یا مہمان نوازی) مشاعرے کے فوراً بعد اس نے اپنی تیز آواز میں اعلان کر دیا کہ ندیم کی نظم مشاعرے میں پڑھی جانے والی باقی سب نظموں سے بدرجہا بہتر اور خوبصورت رہی۔ اس پر بیشتر شعرا مسکرا دیئے مگر راشد غصے میں آ گئے۔ ان کے چہرے کا تاثر واضح طور پر اعلان کر رہا تھا کہ منٹو مبالغہ کر رہا ہے۔ منٹو کی تیز نظروں نے راشد کے ردِعمل کو پہچان لیا چنانچہ منٹو نے اسے وہیں سب کے سامنے بازو سے پکڑ کر کہا'' کیوں مسٹر این۔ ایم۔ راشد! تمہارے تیور بتا رہے ہیں کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں مگر کیا اس مشاعرے میں ندیم کی نظم سے بہتر کوئی نظم پڑھی گئی؟ اگر پڑھی گئی تو بتاؤ وہ کون سی نظم ہے؟ بہرحال یہ واضح کر دوں کہ تمہاری نظم تو بالکل نہیں ہے۔'' اس پر ایک قہقہہ پڑا اور راشد نے بھی بادلِ نخواستہ اس قہقہے میں مسکراہٹ کی حد تک شمولیت کرنا مناسب سمجھا، اور کچھ کہا تو صرف اتنا کہ یہ شخص کہیں بھی شرارت سے باز نہیں آتا۔''(۵)

اس واقعہ کو وہ فیض کے خاکے میں بھی دہراتے ہیں لیکن باندازِ دگر:

> ''میں ملتان میں سب انسپکٹر محکمہ آبکاری متعین تھا۔ وہاں سے دہلی آیا۔ اپنے عزیز دوست سعادت حسن منٹو کے ہاں قیام کیا۔ منٹو اس زمانے میں دہلی ریڈیو سٹیشن سے بحیثیت سکرپٹ رائٹر منسلک تھے۔ مشاعرے کے سب شرکاء کے نام تو یاد نہیں مگر جو یاد ہیں وہ یہ ہیں..... فیض احمد فیض، ایم ڈی تاثیر، تصدق حسین خالد، حفیظ جالندھری، ن۔م۔ راشد، روش صدیقی، میراجی، اسرار الحق

مجاز وغیرہ۔ میں عمر میں ان سب شعرا سے چھوٹا تھا مگر جب مشاعرہ ختم ہوا تو منٹو نے ان بڑے شعرا کے ہجوم میں اعلان کیا کہ ندیم کی نظم آپ سب شعراء سے بہتر تھی۔ یہ کہہ کر منٹو نے سراسر زیادتی کی تھی مگر اسے اپنی بات کہنے سے کون روکتا۔ ہر شاعر کا اپنا اپنا ردِعمل تھا۔ فیض صاحب منٹو کا یہ اعلان سن کر مسکراتے رہے اور ن۔م۔راشد یہ کہہ کر رہ گئے کہ یہ شخص کسی بھی مقام پر شرارت سے باز نہیں آتا۔''(۶)

یہ واقعہ انہوں نے منٹو کے خاکے میں بھی قدرے اختصار سے دہراتے ہوئے لکھا کہ آل انڈیا ریڈیو دہلی نے جدید اردو شعراء کو اپنے ہاں مدعو کیا اور ایک یادگار مشاعرہ براڈ کاسٹ کیا، میں بھی مدعو تھا میں نے اپنی ابتدائی نظم 'نیا ساز نئے تان' پڑھی، مشاعرے کے بعد منٹو جہاں بھی بیٹھتا تھا، یہی اعلان کرتا تھا کہ ندیم کی نظم سب سے بہتر تھی (۷)۔ تین مختلف خاکوں میں قاسمی صاحب نے اس ایک ہی واقعے کو یوں دہرایا ہے کہ جیسے وہ اپنے قارئین کو اچھی طرح سے یاد کرا دینا چاہتے ہوں کہ اُن کی نظم کو منٹو نے اپنے عہد کے تمام بڑے بڑے شعراء کی شاعری سے اعلیٰ پایے کی شاعری قرار دیا تھا۔ دوسرا احساس اس آموختہ سے یہ بھی ابھرتا ہے کہ گویا منٹو کے حوالے سے اُن کے حافظے میں موجود واقعات کے ذخیرے میں سے یہی سب سے اہم واقعہ تھا۔

پچاس صفحات پر مشتمل فیضؔ کا خاکہ متعدد تنازعات کا شکار رہا۔ یہ سب سے پہلے ادبی جریدے معاصر میں شائع ہوا۔ اس پر ردِعمل بہت شدید تھا۔ عبداللہ ملک، حمید اختر اور دیگر متعدد ترقی پسند ادیبوں نے خاصے تند و تیز لہجے میں اس کا جواب دیا۔ اس خاکے میں ایسی کیا بات تھی جس نے اسے اس قدر متنازعہ بنا دیا۔ چند اقتباسات کی مدد سے اسے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں:

''ہمارے درمیان طبقاتی تفاوت تھا، پینے پلانے کی محفلوں میں میری عدم شرکت اس درمیانی فاصلے کا ایک اور اہم سبب ہے۔''(۸)

''دراصل فیض صاحب بورژوا قبیلے سے تعلق رکھتے تھے اور انہی کی صحبت میں خوش رہتے تھے۔''(۹)

''قریب قریب ہر دور میں ارباب حکومت سے ان کے خاصے تعلقات ہوتے تھے۔''(۱۰)

''جب نومبر 1949ء کی کانفرنس کے سلسلے میں انجمن کے نئے منشور اور کانفرنس میں پیش کی جانے والی قراردادوں پر بحث مباحثے کے لئے ترقی پسند مصنفین مل بیٹھتے تھے تو فیض صاحب ان محفلوں میں شاذ ہی شرکت کرتے تھے۔ اسی کانفرنس میں اُس قرارداد کو بھی پیش ہونا تھا جس کا مضمون غیر ترقی پسند ادیبوں کے بائیکاٹ پر مشتمل تھا اور وہ مفصل منشور بھی منظور ہونا تھا جو انتہا پسندی کا شاہکار تھا، مگر فیض صاحب نے ان میں کوئی دلچسپی نہ لی۔''(۱۱)

مندرجہ بالا چند سطور سے فیض احمد فیضؔ کا جو خاکہ احمد ندیم قاسمی کے الفاظ میں ابھر کر سامنے آتا ہے اس سے فیض اشرافیہ کے پروردہ، شراب کے رسیا، بورژوا، اربابِ حکومت کے قریبی اور انجمن کی سرگرمیوں میں عدم دلچسپی کے گناہگار ٹھہرتے ہیں۔ آخری الزام بہت دلچسپ ہے۔ قاسمی خود بتاتے ہیں کہ منشور جس کی منظوری میں فیض صاحب نے کوئی

دلچسپی نہ لی دراصل انتہا پسندی کا شاہکار تھا۔ باقی الزامات بھی ایک طرح کا واویلا ہیں کہ ہائے فیض کی اس قدر پذیرائی ہوتی ہے حالانکہ ان میں اس قدر خامیاں تھیں۔ ان خامیوں کا تجزیہ کیا جائے تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ قاسمی کو دراصل اپنے پیچھے رہ جانے کا قلق تھا اور دراصل وہ شدید قسم کے احساس کمتری میں مبتلا تھے۔ اس طویل خاکے میں انہوں نے اقبال کے حوالے سے اپنے تنقیدی مضمون پر فیض کی شدید ناراضگی اور دوسری عالمی جنگ میں فیضؔ کے فوجی ملازمت قبول کرنے کو بھی ہدفِ تنقید بنایا ہے۔ ترقی پسند نقادوں میں سے دیگر نے بھی اقبال پر تنقید کی تھی جس کا فیضؔ نے اسی طرح بُرا منایا۔ اقبال کے حوالے سے فیضؔ نے ایک خاص پوزیشن اختیار کر رکھی تھی۔ وہ اقبال کو وسیع تناظر میں دیکھتے اور انہیں ترقی پسند اور سامراج دشمن قرار دیتے تھے۔ جہاں تک دوسری عالمی جنگ میں انگریزی فوج کے شعبہ اطلاعات میں فیضؔ کی ملازمت کا تعلق ہے۔ اس کا تعلق عالمی کمیونسٹ تحریک کا نازی جرمنی کے خلاف اتحادی فوجوں کا ساتھ دینے سے تھا۔ ہٹلر کے جرمنی نے سوویت یونین پر حملہ کر دیا تھا اور پوری انسانیت کو نازی ازم سے خطرہ تھا اس لئے سوویت یونین نے دوسری عالمی جنگ کو عوامی جنگ کہہ کر دراصل دنیا کی واحد کمیونسٹ مملکت کے دفاع کی بات کی تھی۔ نہ صرف ترقی پسند بلکہ حفیظ جالندھری سمیت بہت سے اور لوگوں نے بھی فوجی ملازمت اختیار کی تھی۔ جونہی جنگ میں نازی جرمنی اور اس کے دھڑے کو شکست ہوئی، فیض نے فوج سے استعفیٰ دے دیا۔

جہاں تک فیض احمد فیض کے بارے میں احمد ندیم قاسمی کے خاکے کا تعلق ہے تو ان کی منہ بولی بیٹی منصورہ احمد نے کتاب کے آغاز میں 'میری رائے میں' کے عنوان سے اس کا طویل جواب تحریر کیا جو قطعاً غیر ضروری لگتا ہے۔ بالکل اسی طرح غیر ضروری جس طرح ترقی پسندوں نے قاسمی صاحب کے فیض پر لکھے خاکے کا جواب لکھا تھا۔ منصورہ احمد نے پہلے لکھا کہ 'یہ ایک بڑے آدمی کی رائے ہے، دوسرے بڑے آدمیوں کے بارے میں'(۱۲) لیکن پھر خود ہی لمبی چوڑی وضاحتوں میں پڑ گئیں۔ مختصر بات یہ ہے کہ فیض صاحب کو جاننے والے اس بات سے پوری طرح آگاہ ہیں کہ انھوں نے زندگی بھر اپنے اوپر اچھالے جانے والے غلیظ کیچڑ کا کبھی بُرا نہیں مانا۔ پھر یہ تو ان کے ایک ترقی پسند ساتھی کی رائے تھی۔

منٹو پر قاسمی کا خاکہ ہر اعتبار سے توصیفی اور بھرپور ہے۔ بس اتنا ہے کہ اس کے بارے میں بیان کردہ ہر واقعہ میں موصوف کی اپنی تحسین و توصیف کا پہلو بھی ضرور نکلتا ہے۔ مثال حاضر ہے، منٹو نے ایک فلم کے گانے اور مکالمے لکھنے کے لئے احمد ندیم قاسمی کو دہلی بلایا تھا۔ اب پورا بیان انہی کی زبانی سنیے:

> ''میں مکالمے اور گانے لکھنے میں اور وہ میرے مکالمے اور گانے ٹائپ کرنے اور بعض مقامات کی تصحیح میں مصروف تھا، جب منٹو نے ذرا سی تشویش کی حالت میں کہا کہ ''میں 'مصور' کے لئے ہفتہ روا کا میٹریل تو دے آیا تھا مگر اب میرے پاس نئے شمارے کے لئے اداریہ اور اداراتی نوٹ اور مزاحیہ کالم 'بال کی کھال' لکھنے کا وقت ہی نہیں۔ کیوں نہ شاہد لطیف کو بلا لوں۔ وہ علی گڑھ میں موجود ہے اور میرا پرانا دوست ہے۔ اس وقت تک شاہد لطیف اور عصمت چغتائی کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ شاہد لطیف آیا۔ منٹو نے اسے 'مصور' کا اداریہ اور کالم لکھنے کے لئے الگ کمرے میں بٹھا دیا اور ہم دونوں اپنے اپنے کام میں لگ گئے۔ دو ایک گھنٹے کے بعد منٹو نے شاہد لطیف

سے اس کے کام کی رفتار کا پوچھا تو وہ بولا'' یار منٹو!۔۔مجھ سے تو ابھی ایک سطر تک نہیں لکھی جا سکی۔ میں نے اس طرح کا کام کبھی نہیں کیا نا'' منٹو نے ناگواری سے اس کے سامنے سے کاغذات اٹھائے اور میرے حوالے کر دیئے۔ میں نے دوڈھائی گھنٹے کے اندر 'مصور' کا اداریہ اور ادارتی نوٹ اور مزاحیہ کالم 'بال کی کھال' لکھ کر منٹو کے حوالے کر دیئے تو منٹو نے اس کے مطالعے کے بعد اعلان کیا کہ 'مزہ آ گیا' پھر شاہد لطیف کو تنگ کرتا رہا کہ پنجابی ذہن کتنا الرٹ اور ترقی یافتہ ہے اور تم اردو والے کولہو کے بیل ہو.....شاہد سنتا رہا اور ہنستا رہا۔ دو روز کے بعد وہ واپس علی گڑھ چلا گیا۔''(۱۳)

قاسمی اپنے ہر خاکے میں اپنے شراب نہ پینے کا ذکر نمایاں طور پر کرتے تھے۔ایک واقعہ سے ان کی اپنے تئیں اس بڑائی کا اظہار یوں ہوتا ہے:

''دہلی کے ایک سفر میں منٹو نے مجھے بتایا کہ ''فیض احمد فیض صاحب ایم اے او کالج امرتسر کے چند طلبا کو علی گڑھ یونیورسٹی دکھانے لے جا رہے ہیں اور دہلی میں ایک دن کے لئے رُکے ہیں۔آج شام میں نے انہیں ایک ڈرنک پارٹی میں مدعو کیا ہے۔تم تو بدنصیب ہو کہ ڈرنک ورنک نہیں کرتے مگر تمہیں میرے ہمراہ اس پارٹی میں شامل ہونا ہوگا۔'' ظاہر ہے میں کیسے انکار کر سکتا تھا۔کسی ہوٹل میں، جس کا نام یاد نہیں، یہ پارٹی برپا ہوئی۔کم وبیش پندرہ بیس اصحاب مدعو تھے۔ منٹو کے اور میرے علاوہ فیض، راشد، بیدی، کرشن، میراجی، اشک، ممتاز مفتی، حفیظ جاوید، دو چار اور شعرا (جن کے نام یاد نہیں آ رہے ہیں) اور مولانا چراغ حسن حسرت اس محفل میں شامل تھے۔ شرب ونوش کا آغاز ہوا تو میں نے ویٹر سے کہا کہ میرے سامنے رکھا گلاس اٹھا لے جائے۔مولانا حسرت میرے قریب تشریف فرما تھے، بولے'' کیوں کیا آپ بوتل سے منہ لگا کر پئیں گے؟'' سب لوگ ہنسے تو منٹو نے وضاحت کی کہ ندیم نہیں پیتا۔اس پر مولانا حسرت نے فرمایا کہ'' آپ کو مولانا غلام مرشد کا رشتہ دار ہونے کا کتنا نقصان ہوا۔بہرحال جب آپ رندوں کی اس محفل میں شامل ہیں تو کچھ تو کیجئے۔ہمیں سوڈے کی بوتلیں ہی کھول کھول کر دیجئے۔'' میں نے یہ ڈیوٹی بسروچشم قبول کی اور یار لوگ خوش گپیوں کے ماحول میں پینے پلانے لگے۔''(۱۴)

اختر شیرانی کا خاکہ بھی بہت دلچسپ ہے۔قاسمی صاحب نے اس رندِ بلانوش کے کردار کی عظمت کو بیان کرتے ہوئے ذرا بھی بخل سے کام نہیں لیا۔قاسمی صاحب کے بیروزگاری کے دن تھے اور وہ اپنے بڑے بھائی کے پاس لاہور میں ٹھہرے ہوئے تھے۔انہیں ایک دن اپنی بندر رہائش پرتالے میں ٹکا ہوا نہایت خوش خط الفاظ میں اختر شیرانی کا رقعہ ملا جس میں قاسمی کو مخاطب کیا کہا گیا ملاحظہ کیجیے:

''میں نے سنا ہے تم بیکار ہو اور تمہیں کوئی ذریعہ معاش نہیں مل سکا۔میں تمہارا بڑا بھائی ہوں اس لئے تمہیں حکم دیتا ہوں کہ جب تک تمہارے روزگار کا کوئی بندوبست نہیں ہو جاتا تم میرے خرچ پر

صبح کا ناشتہ، دوپہر کا کھانا، بعد دوپہر کی چائے اور رات کا کھانا عرب ہوٹل میں کھاؤ گے۔نہیں کھاؤ گے تو میرے پاس نہ آنا۔ میں تم سے بات نہیں کروں گا۔اور اگر کوئی مہمان یا دوست ساتھ ہوا تو اسے بھی کھانے میں شامل کرو گے۔'' ظاہر ہے بھائی جان اس پیشکش سے بہت متاثر ہوئے اور اختر صاحب کی آخری دھمکی کے پیش نظر مجھے مشورہ دیا کہ عرب ہوٹل چلے جایا کرو ورنہ اختر صاحب کا سافرشتہ سیرت دوست کھو بیٹھو گے۔ میں دو تین مہینے تک عرب ہوٹل میں ناشتہ کرتا اور کھانا کھاتا رہا اور اپنے مہمانوں کو بھی کھلواتا رہا۔ایک روز عرب ہوٹل کے مالک نے مجھے بتایا کہ ویسے تو اختر صاحب مہینوں تک اپنا حساب نہیں چکاتے مگر جب سے تم ان کے خرچ پر میرے ہوٹل میں کھانا کھانے لگے ہو اختر صاحب مہینے کی پہلی تاریخ کو آتے ہیں اور سارا حساب چکا دیتے ہیں۔آخر تم ان کے کیا لگتے ہو؟ میں نے کہا''میں ان کا چھوٹا بیروزگار بھائی لگتا ہوں۔''(۱۵)

اپنی شاعری کے حوالے سے قاسمی صاحب بے حد حساس تھے۔اپنے خاکوں میں انہوں نے اس حوالے سے خود ستائشی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔اختر شیرانی کا ہی ایک واقعہ لکھتے ہیں کہ میں نے رسالہ نقوش جاری کیا تو ایک روز اختر ایبک روڈ پر رسالہ کے دفتر تشریف لے آئے اور بولے:

''ندیم! میں نے تمہارا رسالہ دیکھا ہے، اس میں تمہاری ایک غزل درج ہے۔اس کا ایک شعر ہے ؎

کسی چمن میں بس اس خوف سے گزر نہ ہوا
کسی کلی پہ نہ بھولے سے پاؤں دھر جاؤں

یہ غزل تو مجھے کہنا چاہئے تھی۔تم نے کیسے کہہ لی؟ یہ ان کی طرف سے میرے شعر کی تحسین تھی۔''(۱۶)

احمد ندیم قاسمی کے خاکوں کے یہ دونوں مجموعے اردو خاکہ نگاری کی روایت کا قابل قدر حصہ ہیں۔جن میں ہماری انقلابی تاریخ بھی در آئی ہے۔ بزرگوں میں سے انہوں نے مولانا عبدالمجید سالک، مولانا غلام رسول مہر، مولانا چراغ حسن حسرت، اختر شیرانی اور احسان دانش کے خاکے لکھ کر ان کی بزرگی کا حق ادا کر دیا ہے۔بزرگوں کی اس فہرست میں امتیاز علی تاج کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔اسی طرح مرزا محمد ابراہیم، دادا امیر حیدر اور ڈاکٹر اقبال شیدائی پر قلم اٹھا کر انہوں نے انقلاب کی داعی اس پوری روایت کو دستاویز بنا دیا ہے۔اپنے ادبی ہم عصروں میں منٹو، فیض اور ن م راشد کے ساتھ ساتھ ظہیر کاشمیری، کرشن چندر، مختار صدیقی، ظہور نظر، ابن انشاء، خدیجہ مستور، حسن عابدی اور محمد طفیل کو اپنی یادوں کا حصہ بنا کر بہت سے بھولے بسرے کرداروں کو قرطاس پر دائمی زندگی عطا کی دی۔احمد ندیم قاسمی نے اپنے جونیئر لکھنے والوں پروین شاکر اور کاوش بٹ کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔خصوصاً پروین شاکر کا خاکہ ایک بزرگ ہم عصر کی قابلِ قدر گواہی ہے۔احمد ندیم قاسمی کے خاکے جہاں دلچسپ ہیں وہیں ان کے اسلوب کی چاشنی بھی دل کو موہ لیتی ہے۔جیسے کہ پہلے کہا گیا کہ ان خاکوں میں خود قاسمی صاحب بھی قدم قدم پر موجود ہیں۔گویا یہ خاکے اُن کی سوانح عمری کے لیے بھی بنیادی حوالے کا درجہ رکھتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ فارغ بخاری، البم، (لاہور: فنون پبلشرز، اکتوبر ۱۹۷۸ء)، ص ۵۲

۲۔ احمد ندیم قاسمی، میرے ہمسفر، (لاہور: اساطیر ۲۰۰۲ء)

۳۔ احمد ندیم قاسمی، میرے ہمقدم، (لاہور: سنگِ میل، ۲۰۰۷ء)

۴۔ میرے ہمسفر، ص ۸۔۹

۵۔ ایضاً، ص ۹۳

۶۔ ایضاً، ص ۱۰۷

۷۔ ایضاً، ص ۵۶

۸۔ ایضاً، ص ۱۰۶

۹، ۱۰۔ ایضاً، ص ۱۱۰

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۱۱

۱۲۔ میرے ہمسفر، ص ۱۱

۱۳۔ ایضاً، ص ۵۱۔۵۲

۱۴۔ ایضاً، ص ۹۵۔۹۶

۱۵۔ میرے ہمقدم، ص ۱۵۔۱۶

۱۶۔ ایضاً، ص ۸۱